مولانا محمد فضل اللہ

سانحہ پشاور اور ہمارے صحافتی رویے، چند گزارشات!

سانحہ پشاور ملکی تاریخ کا بدترین سانحہ ہے، بلکہ مجموعی اسلامی تاریخ کا المناک اور پھول جیسے معصوم بچوں کے خون ناحق سے رنگین ہے۔اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ ظاہر ہے ہم آج کچھ بھی کریں اس سے ان غمزدہ لوگوں کی خوشیاں نہیں لوٹائی جاسکتیں ۔اس پر بہت لکھا جاچکا، ٹاک شوز میں کافی کچھ کہا گیا ، ہر طرف سے اس کی مذمت ہوئی ۔ہم بھی کھل کر اس کی مذمت کرتے ہیں اور ببانگ دہل معصوم بچوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے والوں سے براءت کا اظہار کرتے ہیں چاہے وہ کوئی بھی ہو۔

ہماری صفوں سے تو بہت پہلے پاکستان میں ہر قسم کی مسلح جدوجہد کو ملک وملت کے لئے خطرناک قرار دیا گیا،اسلحہ اٹھانا سب کے لئے نامناسب قرار دیا گیا، چاہے ریاستی ادارے ہوں یا غیر ریاستی مسلح قوتیں ہوں ،پشاور اور جامعہ اشرفیہ لاہور کے اجتماعات اور ان میں علمائے کرام کی بھرپور شرکت اور بیک آواز تشدد کی مخالفت اس کے واضح ثبوت ہیں، لیکن اس وقت کسی نے (بشمول حکومت ،ریاستی اداروں اور میڈیا) بھی اس کو سنجیدہ نہیں لیا؛ تا آنکہ پشاور کا المناک ترین سانحہ ہوا۔

اب ہمارے ملک کے دانشور، تجزیہ نگار،صحافی اور کالم نگار اس پر لکھ رہے ہیں، تجاویز دے رہے ہیں، ہم بھی اس کو پڑھ رہے ہیں، برت رہے ہیں۔ میں ملک کے موقر روزنامہ جنگ کا تقریباً مستقل قاری ہوں۔ یہ ایک اچھا سلسلہ ہے کسی بھی زندہ قوم میں ایسے افراد کا وجود از حد ضروری ہے جو وقوع پذیر ہونے والے حالات وواقعات کا تجزیہ کریں ، ان کے اسباب وعوامل تلاش کریں ، ملک وقوم کو درپیش مسائل کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔

سانحہ پشاور کے حوالے سے ہونے والے تبصرے ، تجزیے ہماری قومی زندگی کا فطری تقاضا اور زندہ قوم ہونے کا ثبوت ہیں۔ تاہم ایک تجزیہ نگار وصحافی کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ وہ غیر جانبدار ہو، نہ تو وہ خود اشتعال میں آئے اور نہ ہی اس کی تحریر، تجزیہ دوسروں کے لئے اشتعال انگیز ہو، اس کا اولین مقصد قوم ،حکومت اور ریاستی اداروں کی رہنمائی ہونی چاہئے۔ایک صحافی کے شایان شان

نہیں کہ وہ جذبات سے مغلوب ہوکر لکھے یا کسی واقعہ کی آڑ میں کسی شخصیت ،معاشرہ کے کسی طبقہ،کسی قومی اکائی جو ذاتی طور پر اسے پسند نہ ہو، پر اپنے دل کی بھڑاس نکال دے۔اس سے مزید پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔معاملات سلجھنے کے بجائے مزید الجھیں گے۔پھر کتاب وسنت کی تعبیر وتشریح اور اسلامی شعائر کا معاملہ تو باریک تر ہے۔اس حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے احتیاط لازم ہے۔خواہ مخواہ اپنی عاقبت خراب کرنے سے گریز کرنا چاہئے۔بدقسمتی سے سانحہ پشاور کے بعد ہمارے بعض انتہائی محترم اہل قلم لٹ لے کر علماء ،مدارس دینیہ ،طلبہء مدارس دینیہ کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔زیادہ تفصیل میں نہیں جاتا ایک دو سینئر اہل قلم کا حوالہ دے کر اپنی بات پوری کرتا ہوں۔

محترم عطاء الحق قاسمی صاحب ہمارے عہد کے بہت بڑے ادیب، دانشور اور کالم نگار ہیں۔میں پابندی سے ان کا کالم پڑھتا ہوں اوران کی ظرافت اور بذلہ سنجی کا لطف اٹھاتا ہوں۔جمعہ ۱۹ دسمبر کے روزنامہ جنگ میں ''مذہبی شدت پسندی'' کے عنوان سے ان کا کالم شائع ہوا ہے۔ایک ذیلی عنوان ''مذہبی جماعتوں کے تبلیغی اجتماع'' کے تحت لکھتے ہیں:

> ''یہاں رقت آمیز لہجے میں اللہ تعالی سے گڑگڑا کر اور زار وقطار روتے ہوئے اپنے گناہوں کی معافی مانگی جاتی ہے،لیکن کیا یہ معافی ان گناہوں کے حوالے سے مانگی جاتی ہے جن کا تعلق صرف ان کی ذات سے ہوتا ہے؟یا اس معافی میں وہ گناہ بھی شامل ہوتے ہیں جو معاشرتی گناہ ہیں اور جن کی وجہ سے ہمارا معاشرہ مکروہ ترین معاشرہ بنتا چلا جا رہا ہے؟کیا اللہ کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگنے کے بعد ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے گذشتہ گناہ معاف ہوگئے ہیں؛ لہٰذا اب آئندہ دنوں کے لئے گناہوں کا نیا اکاؤنٹ کھول لیا جائے؟''

جناب قاسمی صاحب اوران کے قارئین کی خدمت میں چند گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

گناہ اور توبہ کے حوالے سے قرآن وسنت کے حوالے سے جو میں سمجھا ہوں، اپنے اساتذہ اور علمائے اسلام کی کتب سے جو استفادہ کیا ہے، ذیل کے چند پوائنٹس میں اس کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے:

☆ گناہ ومعصیت کا تصور اسلام میں خالق ومالک اور سب سے بڑے محسن کی ناشکری اور احسان فراموشی کا ہے،معاصی کے اپنے آثار وعواقب اور نحوستیں ہیں۔

☆ توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اپنے احسان فراموشی کا احساس ہوجائے اور اپنے کئے پر نادم

ہوجائے ۔ علمائے اسلام نے قبول توبہ کے لئے یہ شرطیں بیان کی ہیں (۱) فی الفور گناہ ترک کردے (۲)اپنے کئے پر ندامت ہو(۳) آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم ہو،مزید برآں اگر وہ گناہ حقوق العباد سے متعلق ہوتو اس حق کی ادائیگی کرے یا معاف کروائے۔ادائے حقوق کے بغیر محض توبہ سے بندوں کے حقوق سے متعلقہ گناہوں کی معافی کا تصور اسلام میں نہیں، یعنی ضابطہ یہی ہے ۔گناہ صغیرہ یعنی چھوٹے گناہ بعض نیک کاموں سے بھی معاف ہوجاتے ہیں؛ بشرطیکہ گناہ کبیرہ سے اجتناب ہو اور گناہ کبیرہ کی معافی کے لئے معافی مانگنا ضروری ہے ۔قرآن کریم کی متعدد آیات مبارکہ اور احادیث صحیحہ مذکورہ بالا مضمون پر دلالت کرتی ہیں ۔

اگلے عنوان ہے ''حوروں کا تذکرہ'' اس کے تحت قاسمی صاحب لکھتے ہیں: '' فسادی علماء اور واعظ خطبہ ہائے جمعہ میں دل میں حسرتِ گناہ لئے چسکے لے لے کر حوروں کا لذت آمیز بیان طویل سے طویل تر کرتے چلے جاتے ہیں'' ۔آگے چل کر لکھتے ہیں: ''صرف یہی نہیں اردو بازار کی دکانیں ان لغویات سے بھری پڑی ہیں جنہیں اسلام کے غلاف پوش میں پیش کیا گیا ہے ۔یہ کتابیں پڑھ کر ایک صحیح الفکر مسلمان کے دل میں کراہت پیدا ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ کتابیں دہشت گرد تیار کرنے والوں کے بہت کام آتی ہیں،افسوس! میں وہ تفصیل بیان نہیں کرسکتا جو ان کتابوں میں حوروں اور جنتیوں کی مردانگی کے حوالے سے دی گئی ہوتی ہے ۔ یہ تفصیل پڑھ کر صرف توبہ توبہ کا ورد ہی کیا جاسکتا ہے ۔یہ سب کمزور اور وضعی حدیثوں سے اخذ ہیں ۔ان کے مطابق بڑے سے بڑا گناہ بھی فلاں عبادت سے معاف کیا جاسکتا ہے ۔چنانچہ ہم قتل کرتے جاتے ہیں، ملاوٹ کرتے جاتے ہیں، قبضے کرتے چلے جاتے ہیں اور عبادت کرتے چلے جاتے ہیں ۔''

محترم قاسمی کی خدمت میں دردمندانہ گذارش ہے کہ جناب! ایک تو حدیث شریف بلکہ پورے ایک سلسلے اور ایک مضمون سے متعلقہ احادیث پر ضعف ،کمزوری بلکہ وضع کا حکم لگانا ہماشما کا کام نہیں اور نہ ہی کوئی فکاہی کالم اس کے لیے درکار سنجیدگی کا متحمل ہے ۔اس انتہائی نازک کام کے لئے ٹھوس علمی استعداد ،محدثین کے بیان کردہ تمام علوم ضروریہ سے واقفیت اور ان پر دسترس ، تمام ذخیرۂ احادیث پر بصیرت افروز نظر،خداوند کریم کی طرف سے عطا کردہ سمجھ بوجھ،علمی ملکہ اور وہبی علم وتوفیق ضروری ہے ۔ جن لوگوں میں یہ شرطیں موجود ہوں اور اس فن کے اہل اختصاص ہوں، انہیں تجربہ ومہارت حاصل ہو، وہی اس سلسلے میں اتھارٹی ہیں ۔آپ سے گزارش ہے کہ اپنے حدود میں کام کریں ،اپنے آپ کو متنازع نہ

بنائیں ،قوم کے لئے مزید الجھن اور پیچیدگیاں پیدا نہ کریں ۔مزید برآں مذکورہ بالا دونوں مضامین قرآن کریم کے آیات مبارکہ سے قطعی طور پر ثابت ہیں، اور ان کا معنی بھی یقینی طور پر صاف اور واضح ہے۔ نیز صحیح احادیث کی ایک معقول تعداد میں ان کا صاف اور بے غبار ذکر ہے۔ایسی صورت حال میں آنجناب کیا فرماتے ہیں؟!!

دوسرے اہل قلم بھی روزنامہ جنگ میں لکھنے والے جناب یاسر پیرزادہ صاحب ہیں، میں انہیں بھی تقریباً مستقل پڑھتا ہوں،تقریباًاس لئے کہا کہ کبھی جنگ اخبار ہی ہم تک نہ پہنچ پائے تو الگ بات ہے۔اتوار ۲۱ دسمبر کے شمارے میں انکے کالم کا عنوان ہے: if you not against then you are with them (اگر آپ ان کے خلاف نہیں تو پھر آپ ان کے ساتھ ہیں)۔ وہ لکھتے ہیں: ایسا سوگ اس قوم نے پہلے نہیں منایا اور ایسے غصے کا اظہار بھی ہم نے ۱۹۷۱ کے بعد کبھی نہیں کیا۔اس وقت ہمارے لیڈران وہ تمام فیصلے کر سکتے ہیں جو عام حالات میں ممکن نہ ہوتے ۔میڈیا پر دہشت گردوں کے حمایتیوں پر پابندی سے لے کر مدرسوں کو حکومتی تحویل میں لینے تک۔۔۔۔۔۔

یاسر پیرزادہ صاحب !حکومت سے اپنے سکولز ،کالجز نہیں سنبھالے جارہے ،ملکی یونیورسٹیوں، ہائرایجوکیشن کمیشن کی حالت آپ سے بہتر کون جانے ؟ کہ آپ مدارس کو حکومتی تحویل میں لینے کی بات کرنے لگے ہیں ۔گذشتہ دنوں سید عدنان کاکا خیل صاحب نے ڈاکٹر عامر لیاقت سے ان کے ایک پروگرام میں سوال کیا تھا کہ مدارس کا موجودہ مخصوص نصاب ونظام تعلیم برصغیر پاک وہند میں کم ازکم سو ڈیڑھ سو سال سے رائج ہے اور دہشت گردی، انتہاپسندی وغیرہ الفاظ زیادہ سے زیادہ ایک دہائی سے ہمارے ہاں رائج ہوئے ہیں۔ اگر مدارس دہشت گردی کے اڈے ہیں اور شدت واشتعال پھیلا رہے ہیں، تو دس بارہ سال پہلے ایسا کیوں نہیں ہوا ؟ پھر انتہاپسند کیا صرف مدارس میں ہیں ؟عصری تعلیمی اداروں سکولز وکالجز میں نہیں!!!

یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ علماء ،طلبہ ،مدارس دینیہ سے وابستہ حضرات اور مذہبی لوگ اسی طرح ایک قومی اکائی ہے، جس طرح کہ سیکولر اداروں سے وابستہ مذہب بیزار لوگ۔ ملک وقوم کے لئے مذہب پر عمل پیرا لوگوں کی قربانیاں کسی دوسرے طبقے سے کم نہیں۔ مذہبی لوگ بھی اتنے ہی محبّ وطن ہیں جتنے دوسرے ہیں، بلکہ ان سے زیادہ۔ جناب والا !ہم بھی آخر اس ملک کے شہری ہیں، مغرب کے رنگ میں رنگے ہوئے نہ سہی، لیکن محبّ وطن اور اس ملک وقوم کے خیر خواہ تو ہیں۔اسلامی ،مشرقی تہذیب

وتمدن اور طرز زندگی ہمارا سرمایۂ حیات ہے اور مقدور بھر اس کے تحفظ کے لئے ہم یکسو ہیں۔قوت دلیل ہمارا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ مکالمہ، مذاکرات ،سنجیدہ گفتگو پر یقین رکھتے ہیں۔ کیا اس حالت میں بھی آپ ہمیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں؟

سانحہ پشاور کے حوالے سے نہایت درست تجزیہ معروف تجزیہ کار جناب سلیم صافی صاحب کا ہے۔ روزنامہ جنگ ۲۰ دسمبر کے شمارے میں ''پس چہ باید کرد'' کے عنوان سے ان کا کالم شائع ہوا ہے۔ حکومت اور عسکری ادارے اگر واقعی حالات سدھارنے میں مخلص ہیں تو انہیں یہی بنیادی اقدامات کرنے ہوں گے، جو صافی صاحب نے ذکر کئے ہیں۔

محترم ڈاکٹر شاہد مسعود صاحب نے بھی اچھا تجزیہ کیا ہے کہتے ہیں کہ عرصہ بیس پچیس سال میں جب ہمیں جہاد اور مجاہدین کی ضرورت تھی، ایک فضاء بنی۔ پھر جنرل مشرف نے یوٹرن لیا۔ اب فوج تو ایک منظم ادارہ ہے وہاں تو یوٹرن لیا گیا، اگرچہ وہاں بھی بعض اوقات مسائل پیدا ہوئے ،لیکن قومی سطح پر کوئی ایسا منظم ادارہ نہیں تھا کہ وہاں بھی یوٹرن لیا جاسکے۔

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب جن شدید الفاظ میں اس واقعہ کی مذمت کی جسے القرآن ڈاٹ کام پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے ،اسی طرح مولانا سمیع الحق صاحب ،مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور دیگر مقتدر علماء کرام نے بھی نہ صرف شدید الفاظ میں مذمت کی بلکہ متاثرہ سکول کا دورہ کر کے متاثرہ خاندانوں کے ساتھ تعزیت کی ،اس کے ساتھ بہت سے بچے اس سانحہ میں کسی نہ کسی مذہبی شخصیت یا اس کے رشتہ داروں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود مدارس کے پیچھے ہی لگے رہنا صریح ناانصافی ہے۔ وفاقی وزیر داخلہ چوہدری نثار علی خان صاحب نے میرے خیال میں سیاسی بالغ نظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بروقت ایک مثبت بیان دیا ہے کہ مدارس کو بے جا ہدف تنقید نہ بنائیں۔

آخر میں یاسر پیرزادہ صاحب کی تسلی کے لئے عرض ہے، we are against them ٹھیک ہے نا؟!

زیر تعمیر جامع مسجد شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ کا فیس بک اکاؤنٹ

https://www.facebook.com/jamiamasjidmolanaabdulhaq